کلمہ حق

مسٹر رابن کک! یہ ایجنڈا ادھورا ہے

لاہور کے ایک اردو روزنامے میں برطانی وزیر خارجہ مسٹر رابن کک کا یہ بیان نظر سے گزرا ہے کہ اسلام اور مغرب کے درمیان پائی جانے والی غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے یورپی یونین اور اسلامی تنظیم (او آئی سی) کے درمیان مذاکرات کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک اسلامک سنٹر میں اپنی کسی تقریر کا حوالہ بھی دی ہے جس میں انہوں نے "اسلام اور مغرب کے اشتراک" پر اظہار خیال کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس بات کا عندیہ دیا ہے کہ اس حوالہ سے یورپی یونین اور او آئی سی میں بہت جلد مذاکرات شروع ہونے والے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یورپی یونین اور او آئی سی میں مذاکرات کے لیے جن عنوانات کی نشاندہی کی ہے' ان میں مشرق وسطیٰ میں قیام امن' افغانستان' دہشت گردی' منشیات' انسانی حقوق اور اقلیتوں کے حقوق جیسے مسائل شامل ہیں۔ جبکہ ایک اور اخباری رپورٹ کے مطابق پاکستان میں امریکہ کے نئے سفیر مسٹر میلام نے بھی امریکی عوام اور مسلمانوں کے مابین غلط فہمیوں کے ازالے کی ضرورت پر زور دیا ہے اور اس سلسلہ میں اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے پاکستانی دانش وروں سے اپیل کی ہے کہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلے کم ہونے چاہئیں۔ مغرب کے ان دو ذمہ دار نمائندوں کی اس گفتگو سے مغرب اور مسلمانوں کے درمیان دن بدن بڑھتی ہوئی کشیدگی کے نتائج کے بارے میں مغربی رہنماؤں کی تشویش کا اندازہ ہوتا ہے جس نے انہیں بظاہر اس ضرورت کا احساس دلایا ہے کہ باہمی گفت وشنید اور مذاکرات کی کوئی ایسی صورت ضرور نکلنی چاہئے جس سے غلط فہمیوں کا ازالہ ہو اور دونوں فریق شکوک وشبہات کی فضا سے نکل کر ایک دوسرے کے موقف اور پوزیشن کو صحیح طور پر سمجھتے ہوئے باہمی تعاون واشتراک کے امکانات کا جائزہ لے سکیں۔

جہاں تک مسلمانوں اور اہل مغرب کے درمیان گفت وشنید' غلط فہمیوں کے ازالہ اور باہمی تعاون واشتراک کی راہیں تلاش کرنے کا تعلق ہے' ہمیں اس کی ضرورت کا احساس ہے اور ہم اس حوالہ سے مغربی دانش وروں کی اس سوچ کا خیر مقدم کرتے ہیں بلکہ ہمارے

نزدیک تو جناب رسالت مآب ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات خود ہماری مذہبی ضروریات اور تقاضوں میں شامل ہے کہ آنے والے دور میں مسلمانوں اور مسیحی امت کے درمیان تعاون واشتراک کی فضا ہموار ہو کیونکہ نبی اکرم ﷺ کے واضح ارشادات کی رو سے ان دونوں قوتوں نے مل کر اپنے مشترکہ دشمن کو شکست دینا ہے اور پھر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے نزول کے بعد ان کے پرچم تلے متحد ہو جانا ہے' اس لیے "مسلم مسیحی ڈایلاگ" کی آواز جس سمت سے بھی بلند ہو' ہم اسے اپنی آواز سمجھتے ہیں اور اس پر ہر وقت لبیک کہنے کو تیار ہیں مگر اس سلسلہ میں دو باتیں بطور خاص توجہ طلب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مذاکرات اور گفتگو کن طبقات کے مابین ہوگی اور دوسری یہ کہ "مسلم مسیحی ڈایلاگ" کا ایجنڈا کیا ہوگا؟ کیونکہ برطانوی وزیر خارجہ مسٹر رابن کک نے مذاکرات کے جن دو فریقوں اور گفتگو کے جس ایجنڈے کا تذکرہ کیا ہے' وہ دونوں حقائق سے مطابقت نہیں رکھتے اس لیے کہ بات "اسلام اور مسیحیت" کے مابین قرب کی فضا ہموار کرنے کی ہو رہی ہے جبکہ صورت حال یہ ہے کہ نہ تو مغرب کی موجودہ حکومتیں "مسیحیت" کی نمائندگی کرتی ہیں اور نہ ہی او آئی سی میں شامل مسلمان حکومتیں "اسلام" کی نمائندگی کا حق رکھتی ہیں بلکہ یہ دونوں قوتیں اپنی تشکیل اور کردار دونوں لحاظ سے خالصتاً سیکولر حیثیت کی حامل ہیں اور دونوں کا فکری' ثقافتی اور تربیتی سرچشمہ ایک ہے اس لیے اسلام اور مسیحیت کے حوالہ سے ان دونوں کے درمیان مذاکرات اور گفت وشنید کا مطلب مکر وفریب اور جعل سازی کے سٹیج پر ایک اور ڈرامہ پیش کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا اور اسے زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہب گریز طبقات کی بات چیت ہے جو مذہب کے بڑھتے ہوئے رجحانات سے خوفزدہ ہو کر باہمی مفادات کے تحفظ کے لیے اشتراک وتعاون کے امکانات تلاش کر رہے ہیں' اس لیے اسے اسلام اور مغرب کے درمیان ڈایلاگ قرار نہیں دیا جا سکتا اور یورپی یونین اور او آئی سی کے درمیان مجوزہ مذاکرات کے باوجود اسلام اور مغرب کے درمیان گفتگو کی ضرورت بدستور باقی رہے گی۔

ہمارے نزدیک اسلام اور مغرب کے درمیان حقیقی ڈایلاگ کے اصل فریق مسلمانوں اور مسیحی امت کے مذہبی قائدین ہیں جنہیں ان دونوں امتوں کے سیکولر عناصر نے اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے اقتدار کے سرچشموں پر قبضہ جما رکھا ہے اور انسانی سوسائٹی کو مذہبی اقدار سے باغی کر کے اسے اقتصادی بد حالی' اخلاقی انارکی اور فکری انتشار کی دلدل میں دھکیل دیا ہے۔ مسٹر رابن کک نے مذاکرات کے ایجنڈے کے طور پر جن مسائل کا ذکر کیا

ہے، ہمیں ان کے وجود سے انکار نہیں ہے اور ہم ان میں سے ہر مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ بحث و تمحیص کے لیے تیار ہیں لیکن یہ سب مسائل نتائج ہیں اور ان کا اصل وہ اسباب ہیں جنہوں نے ان مسائل کو جنم دیا ہے اور ان سب اسباب کا اصل سرچشمہ آسمانی تعلیمات اور مذہبی اقدار سے انحراف ہے جس نے انسانی معاشرہ کو تمام حدود وقیود سے بیگانہ کر کے آزادی کے پر فریب نعرے کی آڑ میں انتشار اور انارکی سے ہمکنار کر دیا ہے اس لیے اصل ضرورت مغرب کے اس کردار پر کھلے دل کے ساتھ گفت وشنید کی ہے کہ اس نے پہلے خود آسمانی تعلیمات سے بغاوت کی اور پھر مسلسل اور پیہم سازشیں کر کے مسلمانوں کو آسمانی تعلیمات اور مذہبی اقدار سے محروم کرنے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ اس مقصد کے لیے مغرب نے مسلمانوں کی سیاسی وحدت کی آخری علامت خلافت عثمانیہ کا تیا پانچہ کر دیا، اکثر مسلم علاقوں پر قبضہ کر کے انہیں قومیتوں اور علاقوں کے حوالے سے الگ الگ ملک بنا دیا، ان سب کے داخلی نظام تبدیل کر کے سیکولر نظام مسلط کر دیا، مسلم ممالک کے معاشی اور معدنی وسائل پر تسلط قائم کر لیا، ان کی سائنسی ترقی اور جدید ٹیکنالوجی کے حصول کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ مسلم ممالک کو حقیقی قیادت سے محروم کر کے اپنی مرضی کی مصنوعی قیادتیں ان پر مسلط کر دیں، مسلم ممالک کو دفاعی لحاظ سے خود کفیل ہونے سے روکا، ان کی اقتصادی پالیسیوں کو عالمی اداروں کے ذریعہ اپنے کنٹرول میں لے لیا، مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کا ناسور پیدا کر کے مسلمانوں کے سینے میں خنجر گھونپ دیا، عرب ممالک کے تیل اور دولت کا وحشیانہ استحصال کیا جو اب بھی جاری ہے اور اقوام متحدہ کی چھتری تلے مسلم ممالک اور اقوام کی آزادی اور خود مختاری کو مغربی مفادات کے شکنجے میں جکڑ کر رکھ دیا اس لیے اگر اس سب کچھ کے نتیجے اور رد عمل میں کہیں کہیں پرجوش مسلمانوں نے ہتھیار اٹھا لیے ہیں اور امن کے حوالے سے مغرب کا یک طرفہ پروگرام ڈسٹرب ہو رہا ہے تو مسٹر رابن کک اور مسٹر میلام کو اس پر بلاوجہ پریشانی کا اظہار کرنے کے بجائے خود اپنے کیے دھرے کے نتائج کا حوصلے کے ساتھ سامنا کرنا چاہیے۔

ہمارے نزدیک اسلام اور مغرب کے درمیان ڈائیلاگ کے اصل فریق دونوں امتوں کے مذہبی اور علمی مراکز ہیں اور ہم بڑی بے چینی کے ساتھ اس سمت پیش رفت کے منتظر ہیں لیکن اگر مسٹر رابن کک اور مسٹر میلام ان مسائل اور ان کے اسباب پر گفتگو کے خواہش مند ہیں تو ہمیں کسی حد تک اس کی افادیت سے بھی انکار نہیں ہے مگر انہیں یہ گفتگو مسلم ممالک کے دار الحکومتوں میں خود اپنی بٹھائی ہوئی حکومتوں سے نہیں بلکہ اسلامی

تحریکات اور مراکز سے کرنا ہوگی اور اس ایجنڈے پر کرنا ہوگی جس کا ہم نے اوپر تفصیل کے ساتھ ذکر کر دیا ہے۔ اس کے بغیر "اسلام اور مغرب" کے عنوانوں سے ہونے والی کوئی بھی گفتگو عالمی سیاست کی سکرین پر ایک اور ڈرامہ سٹیج کرنے کے سوا کوئی مقام حاصل نہیں کر سکے گی۔

(مطبوعہ روزنامہ اوصاف)

بہتر نظام حکومت بنانے کا کام حکومت کی طاقت سے نہیں ہوتا۔ یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جو حکومت سے باہر رہ کر اس مقصد کے لیے جدوجہد کریں۔

اصل یہ ہے کہ بہتر نظام حکومت بنانے کا کام بہتر افراد بنانے سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ لوگ خالص تعمیری انداز میں ذہن بنانے کے کام میں لگیں۔ وہ تقریر و تحریر اور دوسرے ممکن ذرائع سے ایک ایک شخص کے ذہن میں داخل ہونے کی کوشش کریں۔ یہ کام خاموش اور پر امن انداز میں لمبی مدت تک جاری رہے۔ یہ گویا ایک قسم کا تعمیری لاوا پکانا ہے۔ جب افراد کی قابل لحاظ تعداد میں فکر کا لاوا پکتا ہے اور افراد کی زندگیوں میں انقلاب آجاتا ہے تو اس کے بعد سماج میں بھی انقلاب آجاتا ہے۔ اور جب سماج کی اصلاح ہو جائے تو اس کے بعد اصلاح یافتہ حکومت بھی لازماً بن کر رہتی ہے۔

افراد میں انقلاب، سماج میں انقلاب لانے کا باعث بنتا ہے اور سماج میں انقلاب حکومت میں انقلاب لے آتا ہے کیونکہ حکومت (جمہوری نظام) میں سماج کے اندر سے نکل کر ہی تشکیل پاتی ہے۔

تعمیری لاوا پکانا ایک انتہائی خاموشی کا کام ہے۔ اس میں آدمی کو زیادہ کرنا پڑتا ہے مگر اس کو کم کا کریڈٹ بھی نہیں ملتا۔ یہ قوم کا گنبد کھڑا کرنے کی خاطر اس کی بنیاد میں دفن ہو جانا ہے۔ اس کام کی یہی مشکل نوعیت ہے جس کی بنا پر لوگ اس میدان میں محنت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

(مولانا وحید الدین خان)

خرم مرادؒ

پاک امریکہ تعلقات

پاکستانی حکمرانوں نے شروع ہی سے یہ طے کر کے امریکہ سے تعلقات قائم کیے تھے کہ انہیں صرف امریکہ ہی کا بن کر رہنا ہے، کسی اور کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھنا۔ بیچ میں روٹھنے اور خود ہی من جانے کے کچھ مراحل آئے لیکن حکمراں "وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے" کی راہ پر گامزن رہے اور ہمارے خیال میں اب بھی ہیں۔

صدر ٹرومین نے ۱۹۴۹ء میں بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو کو امریکہ کے دورے کی دعوت دی اور پاکستان کی خواہش کے باوجود لیاقت علی خاں کو نظر انداز کر دیا۔ جب انہوں نے روس کی طرف سے ماسکو کے دورہ کی دعوت قبول کر لی تو صدر ٹرمین نے ۲۲ نومبر ۱۹۴۹ء کو انہیں دورۂ امریکہ کی دعوت دے دی، لیاقت علی خان نے جھٹ سے ماسکو کا دورہ منسوخ کر دیا۔ یہ دورہ ایسا منسوخ ہوا کہ پھر اس کے ۱۶ سال بعد صدر ایوب پہلے پاکستانی سربراہ تھے جو اپریل ۱۹۶۵ء میں ماسکو گئے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں، جبکہ روس ایک عالمی طاقت تھا اور پاکستان کا پڑوسی بھی۔

امریکہ سے تعلقات کی خاطر پاکستان نے مسلم ممالک کو بھی نظر انداز کر دیا، یہاں تک کہ سویز کے مسئلے پر بھی وہ مغرب کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ وزیر اعظم سہروردی نے دسمبر ۱۹۶۵ء کو نیشنل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا "امریکہ اور برطانیہ جیسی بڑی قوتوں کے ساتھ بندھنے کے بجائے ہم مسلمان ملکوں کے ساتھ متحد کیوں نہیں ہوتے؟ میرا جواب ہے کہ صفر + صفر + صفر بہرحال صفر ہی رہے گا" (کے عارف، امریکہ پاکستان تعلقات --- دستاویزات (انگریزی) لاہور ۱۹۸۴ء۔ جلد ۱، ص ۱۲۵) ۲۲ فروری کو انہوں نے کہا "یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ ہماری پشت پر ایک طاقتور ملک ہے جو ہماری سالمیت اور سیاسی آزادی کی ضمانت دے رہا ہے" (دستاویزات، ص ۱۳۴) پھر ۲۵ فروری کو انہوں نے مزید کہا "وہ یہ یاد رکھیں کہ ہم دل وجان سے ان کے ساتھ ہیں --- اگرچہ ہم چھوٹے ہیں --- ان کو ہم سے زیادہ بڑا وفادار دوست نہیں ملے گا" (دستاویزات، ص ۱۲۸)

صدر ایوب نے جولائی ۱۹۶۰ء کو فارن افیئرز میں لکھا "پاکستان نے کھلم کھلا اور غیر

مشروط طور پر اپنی قسمت مغرب کے ساتھ وابستہ کر دی ہے" (دستاویزات ص ۱۱۸۷) ۱۷ جولائی ۱۹۶۱ء کو انہوں نے کہا "جب مشکل وقت پڑے گا' تو ایشیا میں پاکستان امریکہ کا واحد دوست ہوگا" (دستاویزات' ص ۲۰۳) امریکہ نے جب آنکھیں پھیرنا شروع کیں تو مسٹر بھٹو نے ۲۴ جولائی ۱۹۶۳ء کو نیشنل اسمبلی میں گلہ کیا "ہم نے مغرب کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ مسٹر خروشچیف نے ہمیں دھمکی دی کہ پاکستان کو نیست ونابود کر دیا جائے گا۔ ہم نے اپنا پورا مستقبل مغرب کے ساتھ اتحاد کر کے داؤ پر لگا دیا۔ دونوں کے درمیان جنگ کی صورت میں ہم نے نیو کلیر جنگ کا خطرہ مول لیا لیکن آج کیا ہو رہا ہے؟" (دستاویزات' ص ۲۲۳)

پاکستان نے' جو امریکہ کا یار وفادار رہا ہے اور اب بھی ہے' اگر امریکہ کے علاوہ کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھا تو امریکہ نے اس کی تذلیل وتحقیر بھی کی' اور سزا بھی دی۔ جب ۱۹۶۲ء میں امریکہ نے بھارت کو زبردست مقدار میں اسلحہ دیا تو صدر ایوب نے جوابی کارروائی کے طور پر مارچ ۱۹۶۳ء میں چین کے ساتھ سرحدی معاہدہ کر لیا' پھر پیکنگ تک فضائی سروس شروع کر دی اور ۱۹۶۴ء میں جاسن کی طرف سے ویت نام میں فوجی دستے بھیجنے کی خواہش کے "احترام" سے انکار کر دیا۔ صدر جاسن نے اپنی ناراضی ظاہر کرنے کے لیے اپریل ۱۹۶۵ء میں ایوب کا مجوزہ دورۂ امریکہ منسوخ کر دیا اور ۱۹۶۵ء میں ہونے والی پاکستان کے امدادی کنسورشیم کی میٹنگ بھی منسوخ کرا دی۔ گویا امریکہ ایک عالمی طاقت ہونے کی حیثیت سے آزاد تھا کہ جس سے چاہے "تعلق" قائم کرے اور پاکستان سے جیسا چاہے' سلوک کرے۔ پاکستان کو ایک چھوٹے' محتاج اور باج گزار ملک ہونے کی وجہ سے یہ اجازت نہ دی جا سکتی تھی کہ وہ ہرجائی پن کا مظاہرہ کرے۔

امریکہ سے ہم کوئی گلہ شکوہ کرنا صحیح نہیں سمجھتے۔ اس نے ہمیں کبھی دھوکے میں نہیں رکھا۔ اس کی پالیسی آغاز ہی سے یکساں اور واضح رہی ہے۔ ہم ہی نے جھوٹے توقعات باندھیں اور خود فریبی میں مبتلا رہے۔ اس کی پالیسی بین الاقوامی سیاست کے اس معروف اصول کے عین مطابق رہی ہے کہ "کوئی دوست' مستقل دوست نہیں ہوتا' اصل دوستی صرف اپنے مفادات سے ہوتی ہے" ہمارا گلہ شکوہ ہے تو اپنے حکمرانوں سے ہے۔ انہوں نے اپنے مفادات کو فراموش کر دیا' آنکھیں بند کر کے امریکہ سے مستقبل دوستی گانٹھی۔ اس کی پشت پناہی کو کافی سمجھا اور پے در پے بین الاقوامی سیاست کی تلخ حقیقتوں سے دوچار ہونے کے باوجود انہی پتوں پر آج بھی تکیہ کیے ہوئے ہیں۔

تعلقات کی تشکیل نو کا چیلنج

آج درون پردہ کیا ہو رہا ہے؟ اس سے ہم زیادہ باخبر نہیں۔ لیکن محسوس یہی ہوتا ہے کہ ماضی کے سارے اسباق، سیاست عالم میں دور رس تبدیلیوں، اور دنیا میں برپا تہذیبی کشمکش کے باوجود یہ تعلقات ماضی کی نہج سے کچھ زیادہ مختلف انداز میں پروان نہیں چڑھ رہے۔ امریکہ کی طرف سے وہی بھارت نوازی اور پاکستان پر چاند ماری ہے، ایٹمی پروگرام سے دست برداری اور منڈیاں کھول دینے پر اصرار ہے، کہ اب کمیونزم کے زوال کے بعد ایک طرف اڈوں، میدان جنگ اور کرایہ کے سپاہیوں کی ضرورت ختم ہو گئی ہے اور دوسری طرف چاند ماری میں شدت سے کسی نقصان کا خدشہ بھی نہیں ہے۔ پاکستان کی طرف سے وہی ڈالروں اور اسلحہ کے لیے گدائی، اور اس کے عوض امریکی مطالبات کی تکمیل۔

بلا شبہ امریکہ کے ساتھ خوش گوار تعلقات ہماری قومی وسیاسی ضرورت بھی ہیں اور نظریاتی بھی۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ ان تعلقات کی نئے خطوط پر تشکیل نو کی شدید ضرورت ہے۔

۱۔ اس تشکیل نو کے لیے سب سے پہلے سیاست عالم کا صحیح ادراک ضروری ہے۔ ہمارا ترپ کا پتا امریکہ کا کمیونزم کی توسیع کا خوف تھا۔ اب یہ پتا ہمارے ہاتھ میں نہیں رہا۔ بھارت کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت کی روک تھام کرنا، یا اس کے ساتھ عدم توازن کو کم کرنا امریکہ کے ایجنڈے میں کوئی مقام نہیں رکھتا بلکہ اس کے برعکس اس کا مفاد یہ ہے کہ بھارت کی طاقت بڑھتی رہے، ہم اپنی حدود میں رہیں، جارحانہ اسلحہ حاصل نہ کریں اور اس کی بالادستی تسلیم کر لیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اب ہمارے کوئی کارڈ نہیں رہ گئے۔

۲۔ اسی طرح مستقبل کی تہذیبی کشمکش کے امکانات اور نہج کا صحیح ادراک بھی ضروری ہے۔ مغرب کے اندازے اور منصوبے اور ہمارے اپنے اہداف اور کرنے کے کام کیا ہیں؟ اس لیے کہ مغرب نے "اسلامی خطرہ" کا جو تصور بنا لیا ہے، اس کے ہمارے تعلقات پر گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور یہ مزید گہرے ہوتے جائیں گے۔ لیکن اسلام کو "خطرہ" کے بجائے ایک "امکان" بنانا ممکن ہے۔

۳۔ یہ جاننا چاہئے کہ ان تعلقات کو خوش گوار رکھنے کے لیے یہ ضروری نہ ہونا چاہئے کہ ہم امریکہ کے دست نگر بھی ہوں یا اس کے ہر مطالبے کے آگے سر جھکاتے چلے جائیں۔ اپنے اہداف کے واضح شعور کے ساتھ ثقافتی ومعاشی محتاجی وگدائی سے نجات پا کر ہمارے لیے یہ ممکن ہونا چاہئے کہ اپنے اہم اور حساس قومی مفادات اور اپنی دینی ونظریاتی

حیثیت قربان کیے بغیر بھی لین دین کے اصول پر خوش گوار تعلقات رکھ سکیں۔

۴۔ امریکہ ایک بڑا طاقت ور ملک ہے' غالب مغربی تہذیب کا لیڈر ہے۔ اگرچہ اس کے مقابلے میں ہمارا ملک بہت چھوٹا ہے اور ہم نے اپنی غلط کاریوں سے اسے اور بہت "چھوٹا" کر دیا ہے۔ ۱۹۸۷ء کے ایک امریکی تجزیے کے مطابق "ایک انتہائی ضعیف حلیف' مفلس اور قلاش جس کی تاریخ سیاسی افتراق وعدم استحکام کی تاریخ ہے" (رابرٹ جی ورسنگ' پاکستان سکیورٹی انڈر ضیاء' لندن۔ ص ۱۱' ۱۲) ہمارے ہاتھ میں کارڈ پہلے بھی زیادہ نہ تھے' اب اور تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ شعور ہونا چاہئے کہ یہ لین دین برابر کا ہونا دشوار ہے۔ لیکن تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ ایک کمزور فریق' اگر حکمت اور واضح حکمت عملی رکھتا ہو' تو کچھ زیادہ دے کر بھی آگے بڑھنے کا راستہ بنا لیتا ہے' بشرطیکہ ہمارے ماضی وحال کے حکمرانوں کی طرح پہلے ہی دل وجان سے غلام بننے کو تیار نہ ہو۔ صلاح الدین ایوبی نے لین دین میں جس نشیب وفراز سے گزر کر بیت المقدس دوبارہ فتح کیا' اس سے واقفیت ہی راہ نمائی کے لیے کافی ہے۔

۵۔ قومی سطح پر جذباتی انداز میں امریکہ پر چاند ماری (America-bashing) کو بھی ختم ہونا چاہئے۔ قرآن نے بتوں کو بھی برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے۔ امریکہ سے اختلاف ہو سکتا ہے' اس پر سنجیدہ اور مدلل تنقید ہونی چاہئے' اس کی دو عملی سیاست کی نقاب کشائی بھی لیکن دشنام طرازی اور غیر منصفانہ تنقید ہمارے دین وایمان کے بھی منافی ہے' ہمارے قومی مفاد کے بھی۔ اس سے کچھ حاصل بھی نہیں۔

۶۔ ہمیں امریکی سیاسی نظام میں طاقت کے ہر مرکز سے اپنے اہداف کے حصول کے لیے رجوع کرنا چاہئے۔ ابتدائی دور کی دوستی "سنہرے لمحات" ایوب خاں جیسے لوگوں کے آئزن ہاور' جان فاسٹر ڈلس اور ایڈمرل ریڈ فورڈ جیسے لوگوں سے ذاتی تعلقات پر قائم تھے۔ جب ڈلس کا انتقال ہو گیا اور آئزن ہاور کی جگہ کینیڈی صدر ہو گئے تو ان کے تعلقات کے نیچے سے زمین سرکنا شروع ہو گئی۔ پاکستانی حکمرانوں نے امریکی حکومت کی دوسری شاخ' کانگریس اور سینٹ سے تعلقات کو کوئی اہمیت نہ دی اور امریکہ میں پاکستان کی کوئی لابی سرگرم کار نہ رہی۔ اب ہمیں وہاں اپنی مضبوط لابی بنانا چاہئے۔ پروفیشنل لابی بھی اور پاکستانی امریکن شہریوں کی لابی بھی۔

۷۔ باہمی تنازعات موجود ہیں اور رہیں گے لیکن ہمیں امریکی حکمرانوں اور پالیسی سازوں' جن سے ہم معاملات کرتے ہیں اور عام امریکی افسران اور عوام کے درمیان فرق

ملحوظ رکھنا چاہئے' اور انصاف اور حق کے حوالے سے براہ راست ان کے دل ودماغ سے اپیل کرنا چاہئے۔ امریکہ ہی میں یہ ممکن ہے کہ بوسنیا کے مسئلے پر اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے تین اعلیٰ افسران استعفیٰ دے دیں اور امریکن عوام امریکہ کو ویت نام اور صومالیہ سے نکلنے پر مجبور کر دیں۔

۸۔ ہمیں امریکہ کی تاریخ' ان کی جڑوں (Roots) اور نفسیات سے بھی آگاہ ہونا چاہئے۔ یہ ملک اللہ سے عہد (Convenant of God) کے ایفا اور حکومت الہیہ (Kingdom of God) کے قیام کی جستجو میں قائم ہوا تھا۔ اگرچہ اب مشہور سوشیالوجسٹ رابرٹ بیلا (Robert Bellah) کے الفاظ میں "نقض عہد کے نتیجے میں یہ میثاق' میثاق شکستہ (broken convenant) بن چکا ہے" اور امریکہ میں مادہ پرستی کا غلبہ ہے' لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس "میثاق" کے ورثے میں ہمیں ایسی بے شمار چیزیں مل جائیں گی جو کلمۃ سواء بیننا وبینکم کا مصداق ہوں۔ اپنی کمزوری اور عدم توازن کے باوجود ہم یہ مشترک اقدار ومفادات تلاش کر سکتے ہیں اور خوش گوار تعلقات میں یہ اپنا حصہ ادا کر سکتے ہیں۔

ہم ڈپلومیٹک عمل میں نئے متعین اقدامات کی نشان دہی نہیں کرنا چاہتے کہ یہ اس عمل سے پوری آگاہی کے بغیر اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہوگا۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن' اگست ۱۹۹۴ء)